Year 2023; Vol 02 (Issue 02)

PP. 12-22 https://journals.gscwu.edu.pk/

جویریہ ظفر

وزیٹنگ لیکچرر، شعبہ اردو

ایمرسن یونیورسٹی ملتان

Jawaria Zafar

Visiting Lecturer, Department of Urdu,Emerson University Multan

مرزا اطہر بیگ کا ناول ’’ غلام باغ ‘‘ اور مابعد نوآبادیاتی مخاطبہ

Mirza Athar Baig's novel "Ghulam Bhag" and Post Colonialism Discourse

Abstract:

Ghulam Bagh is an important novel created in the Post-Colonial period in which Mirza Athar Baig has presented the intellectual and mental attitudes of this era.We can say that Post-Colonial literature refers to the literary texts that are created in the former colonies of Europe. In these writings, the background of PostColonialism and the background of Colonialism are presented in a literary Perspective. Post-Colonial literature shows an attempt to understand, examine and describe the feelings and experiences of those belonging to the former colonies. Mirza Athar Baig's novel Ghulam Bagh was published in 2006 and six editions have been published so far. Ghulam Bagh is a masterpiece novel of fictional literature created in the former British colonial Pakistan, There are also characters living in the Post-Colonial era. Each character shows change, evolution and conflict. Ghulam Bagh is an imaginary place in terms of archeology. If we examine the title of the novel in a broader context, Ghulam Bagh is a metaphor for the desire of western nations to dominate the inferior, weak and noble races of the

world. Is based on desire. In this paper, the novel will be studied in the PostColonial context to find out how far the author has succeeded in recovering the Colonial discourse.

Key Words: British Colonial, Post-Colonial Era, Archeology, PostColonial Context, Discourse.

افسانوی ادب بنیادی طور پر زندگی کے جدلیاتی نظام کی تفہیم اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کا اظہار ہے، غلام باغ فکشن کی دنیا کا ایک استعارہ ہے جس میں ہر ادیب لفظوں کا غلام ہوتا ہے یہ وسیع دائرے میں لکھا گیا ناول ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا اور اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غلام باغ سابقہ برطانوی نو آبادی پاکستان میں تخلیق ہونے والے افسانوی ادب کا شاہکار ناول ہے، مابعد نو آبادیاتی عہد کے جیتے جاگتے کردار بھی موجود ہیں۔ ہر کردار میں تغیر، ارتقا اور کشمکش دکھائی دیتی ہے غلام باغ آثار قدیمہ کے حوالے سے ایک تخیلی جگہ ہے، اس مقالہ میں ہم ناول غلام باغ کا مابعد نوآبادیاتی مابعد نوآبادیاتی تناظر میں کرنے کی کوشش کریں گے۔

اگر ہم وسیع تناظر میں ناول کے عنوان کو پرکھیں تو غلام باغ مغربی اقوام کا دنیا کی کمتر، کمزور اور ارزل نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش کا استعارہ ہے، غلام باغ استعارہ ہے انسانی زبان کا جس میں لسانی بگاڑ سے انسان دیوانگی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غلام باغ ایک ایسا منفرد ناول ہے جو اپنی تکنیک، ہیئت اور زبان و بیان کے لحاظ باقی تمام ناولوں سے مختلف ہے جس میں ساری دنیا ایک غلام باغ ہے جہاں انسان اپنی ہی خواہشات) نفسی خواہشات (کا غلام ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس حوالے سے رقمطراز ہیں :

> " اس ناول کے بیانیے میں ماضی کی آسیبی پرچھائیاں، حال کی بے ترتیبی اور مستقبل کا الجھاؤ ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں اس تصادم سے جو شور پیدا ہوتا ہے وہ ہماری موجودہ عصری کیفیت کا شور ہے۔ نوآبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد چاروں طرف سے گھیرے ہوئے بڑے بڑے جال، ان میں گرفتار خلقت کا اضطراب اور انتشار اور اس انتشار میں زندگی کی معنویت کی تلاش، بے سود کاوشیں، یہ سب کچھ اس ناول کا "پوسٹ کولونئیل" دائرہ متعین کرتا ہے"(۱)

غلام باغ مابعد نوآبادیاتی دور میں تخلیق ہونے والا ایک اہم ناول ہے جس میں مرزا اطہر بیگ نے اس عہد کے فکری اور ذہنی رویوں کو پیش کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعد نوآبادیاتی ادب سے مراد وہ ادبی تحریریں ہیں جو یورپ کی سابقہ نوآبادیوں میں تخلیق ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں مابعد نوآبادیات کے پیش منظر اور نوآبادیات کا پس منظر کو ادبی تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی ادب میں سابقہ نوآبادیوں سے تعلق رکھنے والوں کے جذبات و احساسات اور تجربات کو سمجھنے، پرکھنے اور بیان کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ رؤف نیازی نظریہ مابعد نوآبادیات کے حوالے سے رقم طراز ہیں :

> ''یورپ کے تسلط سے نام نہاد آزادی کے باوجود ان ممالک کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی طور پر کسی نہ کسی سابقہ نظاموں سے وابستگی کے مطالعے اور مضمرات کے مشاہدے کو پوسٹ کولونئیل تھیوری یا پوسٹ کولونیل ازم کہا جاتا ہے''(۲)

اس تناظر میں اگر ہم ناول '' غلام باغ'' کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا اردو ادب کا شاہکار ہے جس میں مرزا اطہر بیگ نے سامراجی آئیڈیالوجی کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول میں انسانی زندگی کی حقیقی اور تصوراتی تصویر پیش جاتی ہے، مرزا اطہر بیگ کا موضوع انسان اور نظریہ فکر انسانی ہے وہ ناول میں نہ صرف ماضی و حال کی تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کی طرف بھی بلیغ اشارہ کرتے ہیں۔ جب ہم اس ناول کو مابعد نوآبادیاتی عہد کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کئی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے جیسا کہ ماضی کی بازیافت، تاریخ کی بازیافت، مشرقی باشندوں کی ذہنی غلامی، مغربی تہذیب و ثقافت کی حقیقت اور اصلیت، انگریزی زبان کی استعماریت، جدید نسلوں کی اپنی تہذیب و ثقافت سے بیگانگی، سامراجی طاقتوں کے حقارت آمیز رویے، نوآبادیاتی عہد کی حقیقتوں کا انکشاف، تیسری دنیا کے ممالک میں غربت، جہالت، پسماندگی اور معاشی استحصال کی وجوہات وغیرہ۔ آج کا ناول سماجی ناہمواریوں، معاشرے میں بڑھتے ہوئے نفسیاتی مسائل، مابعد نوآبادیاتی عہد میں امریکہ اور یورپی ممالک کے خلاف مزاحمتی رویوں سمیت دیگر ان گنت موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔

ناول کل تیس ابواب پر مشتمل ہے ناول کا آغاز کیفے غلام باغ سے ہوتا ہے اور آخری باب بھی غلام باغ کے نام ہی سے ہے۔ ناول میں کہانی کو مربوط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب ہم اس کے عنوان پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ غلام اور باغ ایک دوسرے کی ضد بنتے نظر آتے ہیں؛ باغ ایک زندگی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے جبکہ غلام اسیری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پہلے باب میں کیفے غلام باغ برطانوی عہد کے سامراج کا استعارہ ہے جبکہ آخری باب موجودہ امریکہ اور دیگر یورپی اقوام کی

نئی سامراجیت کا اعلان ہے۔جب ہم کسی بھی تخلیق کو مابعد نوآبادیاتی تناظر میں پرکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے مقامی سوچ اور ثقافت پر استعمار کار اپنا قبضہ حاصل کرتا ہے اور مقامی شناخت کو معدوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے ''مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کسی متن یا فن پارے کی تفہیم کا طریقہ کار ہے۔ایسا متن جو نوآبادی تصور،اس کی قائم کردہ حکمت عملیوں،استعمار کار کے تصور طاقت اور ان کے اذہان میں موجود نیٹو افراد کی مخصوص تشکیل شدہ تشبیہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر ضابطہ تحریر میں لایا گیا ہو''(۳) ناول کے قصے کا آغاز کیفے غلام باغ سے ہوتا ہے جہاں ڈاکٹر ناصر اور کبیر مہدی چائے پینے آتے ہیں۔کبیر مہدی ناول کے مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جس کے ذریعے ناول نگار نے مابعد نوآبادیاتی عہد کے فکری رویوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔کبیر کا تعلق ایک پسماندہ علاقے ہے اس کا اصل نام کبیر مہدی اس کی شناخت نہیں ہے بلکہ وہ سارنگ،ابن بشر اور آدم زاد کے قلمی ناموں سے مضامین لکھتا ہے ناول نگار نے کبیر کو تیسری دنیا میں یورپی اقوام کے خلاف مزاحمتی رویوں کا حامل کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔وہ گہرے فلسفی انداز میں وقت کے بارے میں نظریہ پیش کرتا ہے:

'' ماضی محض تاسف ہے یا پھر کبھی کبھار یہ احساس فخر بن جاتا ہے اور مستقبل بس ایک خدشہ
یا پھر امید۔اور یہ چاروں احساس لمحہ حال کے کیپسول میں بند ہیں''(۴)

اگر ہم لمحہ حال میں یورپ کی سابقہ نوآبادیوں کے رویوں کا جائزہ لیں تو دو رویے ہمارے سامنے آتے ہیں،کہ برصغیر میں بسنے والے لوگ نوآبادکاروں کی غلامی کا شکار ہوئے اور ان کی مقامی شناخت مسخ کر دی گئی انہیں ایک ایسا بے حس انسان بنا دیا گیا جو صرف اشرافیہ کی غلامی کے واسطے چلتے پھرتے ہیں کیونکہ نوآبادکاروں کے جاتے ہی اشرافیہ نے تمام نظام سنبھال لئے اور انہیں کے لیے نوآبادیاتی عہد احساسفخر کی علامت ہے۔تیسری دنیا کے ممالک میں مستقبل ایک امید سے زیادہ ایک خوفکی علامت ہے مستقبل میں دوبارہ یورپی اقوام کی غلامی کا تصور ان کے ذہنوں پر ایکجوف کی شکل میں مسلط ہو چکا ہے پاکستان اور ہندوستان کا شمار بھی ان ممالک میں ہوتا ہے،اور تیسری دنیا کے ممالک کے لیے یہ فکر انگیز صورت حال ہے۔کبیر کا تعلق بھی برطانوی راج کی سابقہ نوآبادیوں سے ہے۔ہاف مین، ڈاکٹر ناصر اور کبیر اکثر کیفے غلام باغ میں ایک ساتھ ہوتے ہیں جب ایک دن وہ سوم رس کے اساطیری اور بنیادی مرکبات کی بائیو کیمسٹری پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو کبیر اور ڈاکٹر ناصر نشہ آور زہریلے پودوں اور مقامی اساطیر پر اپنا قبضہ سمجھتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ساتھ بیٹھا گورا ان کی گفتگو سے متاثر ہو رہا ہے،لیکن غور کرنے کے بعد انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے مرعوب نہیں بلکہ ایک ایسی صورت حال سے محظوظ ہو رہا ہے جیسے نوآبادیاتی عہد میں کوئی انگریز مقامی لوگوں کے منہ سے انگریزی زبان کے جملے سننے

کے بعد ہوتا ہوگا۔ مرزااطہر بیگ نے کبیر مہدی کے روپ میں ایک ایسا باغی کردار تخلیق کیا ہے جو مزاحمتی رویوں اور یورپی اقوام کے خلاف نفرت کو اجاگر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کبیر ناصر سے کہتا ہے:

"یہ سب گورے ایک ہیں۔ ان کی۔۔۔اور ہمیں دیکھو ہم اس پر اپنی علیت کا رعب جھاڑنے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں جو اسی کی دی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہند مسلم تہذیب پر اتھارٹی ہم نہیں بلکہ یہ مستشرقین ہیں"(۵)

مرزااطہر بیگ انہیں کرداروں کی مدد سے مشرقی ممالک میں رائج تعلیمی نظام پر بھی طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ کبیر ناول میں اسی قسم کے خیالات پیش کرتا ہے ڈاکٹر ناصر جو جنرل ہسپتال میں ذہنی امراض کا ڈاکٹر ہے، وہ کبیر کو انہیں خیالات اور نظریات کی وجہ سے خبطی سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر جب کبیر کے ایف ایس سی کرنے کے بعد آرٹس میں چلے جانے کی وجہ سے طنز کرتا نظر آتا ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی اپنی زبان و معاشرت اور تہذیب و ثقافت سے بیگانگی نے ان کے اندر احساس کمتری کو جنم دیا ہے۔ ناول نگار نے کبیر کے کردار کی مدد سے نوآبادیاتی نظام کی ان قباحتوں کو اجاگر کیا ہے جو آج تک جوں کی توں موجود ہیں، مثال کے طور پر جیسے نوآبادیاتی عہد میں برطانوی مستشرقین کو ہند مسلم تہذیب پر اتھارٹی سمجھا جاتا تھا آج بھی صورت حال ویسی ہی ہے۔ کبیر ناول میں بارہا اس بات پر احتجاج کرتا نظر آیا کہ ہم اپنی مقامی چیزوں کو اہمیت کیوں نہیں دیتے ہم جو کہ اعلیٰ تہذیب کے مالک ہیں لیکن ہم مغربی تہذیب و تمدن کو اہمیت دیتے ہیں ہماری مقامی اقدار اور ثقافت مسخ ہوتی جارہی ہیں مشرقی ممالک میں یہ ایک گھمبیر صورت حال ہے کہم ایک کھوکھلی تہذیب کی قیادت میں مصروف ہیں۔ کبیر اور ناصر کے ساتھ ایک تیسرا کردار فریڈرک ہاف مین کا ہے جو غلام باغ پر تحقیق کر رہا ہے اور ایک جرمنآرکیالوجسٹ ہے اور ناول کی کہانی کے مابعد نوآبادیاتی دائرے میں اپنے آقاؤں کی زبان بولتا ہے۔ مقامی شناخت اور ثقافت کو معدوم ہوتا دیکھ کر کبیر ہاف مین سے کہتا ہے:

"تم یہاں کے رؤسا، یہاں کے نودولتیوں، یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں حتیٰ کہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے نام نہاد علمبرداروں کی کوٹھیاں دیکھ لو ان کے عالی شان بنگلے دیکھ لو۔ تمہیں وہاں ایک بھی مقامی درخت نہیں ملے گا ان میں سے کوئی بھی کیکر، نیم، شریں اور شیشم کو اپنے لانوں میں اگانا پسند نہیں کرتا یہ کچھ مقامی درختوں کے نام ہیں۔ یہ سب

تمہیں ملیں گے بس سڑکوں کے کنارے۔ادھر ادھر اکا دکا بس اپنے زور پر اگے ہوئے۔ تم
گوروں نے ہم سے ہماری نباتات بھی چھین لی ہیں "(٦)

اس مکالمے کے تناظر میں جب ہم ہاف مین کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مقصد غلام باغ کا معمہ حل کرنا ہے ۔ نو آبادکاروں کے چلے جانے کے باوجود وہاں کچھ ایسے کردار موجود ہیں کہ انہیں آج بھی تیسری دنیا کے ممالک اپنے شکنجے میں جکڑے محسوس ہوتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار گرٹریوڈ ہے جو ہاف مین کی محبوبہ ہے۔ان دونوں کے مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر وہ آج بھی مشرقی ممالک کو نیچا، کمتر اور رذیل سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہاف مین جب کبیر سے کہتا ہے کہ :

" ایک آرکیالوجسٹ، میرے عزیز، صرف آثار قدیمہ میں ہی نہیں آثار جدیدہ میں بھی
دلچسپی لیتا ہے۔ خواہ وہ آثار جدیدہ تمہارے جیسے دقیانوسی معاشرے کے ہی کیوں نہ ہوں۔
ہاف مین نے ایک عالم مطلق جیسے انداز میں کہا"(٧)

مرزا اطہر بیگ نے اس ناول میں بارہا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس تہذیب و ثقافت کو ہم اپنا آئیڈیل مان رہے ہیں وہ دراصل اندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ تقلید زہر کی صورت میں مشرقی معاشروں میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ مثال کے طور جب کبیر کے پاس کچھ ایسے رسائل ہوتے ہیں جس میں وہ ننگی عورتوں کی تصویریں دیکھتا ہے اور تسکین حاصل کرتا ہے، دوسری طرف گوروں کو یہ خیال ہے کہ مشرقیممالک میں سب سے زیادہ جنسی بھوک کی ماری ہوئی مخلوق پائی جاتی ہے؛ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جنسی بھوک کو بڑھانے میں مغربی میڈیا نے سب سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ مثال کے طور پر کبیر ہاف مین کو گالیاں دیتا ہے تو کہتا ہے کہ :

" ذلیل آدمی۔ کبیر نے کہا تمہاری نسل دنیا کو مردانہ ابھار کی چبھن جتانے کے علاوہ اور کر ہی
کیا سکتی ہے اور ہاف مین حیرت زدہ سارہ گیا"(٨)

کبیر کو جب ہاف مین کی حرکتوں پر شدید غصہ آتا ہے تو وہ اسے گالیاں بکتا ہے اور منہ ہی منہ بڑبڑاتا رہتا ہے۔اس صورت حال میں کبیر کو محسوس ہوتا ہے کہ ہاف مین غلام باغ میں کسی قسم کی تحقیق کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ کوئی جاسوس ہے جو سفارت کار بلکل نہیں بلکہ سفارت کاری کے نام پر جاسوسی کر رہا ہے۔ جب کبیر اپنے خدشات کا اظہار واضح الفاظ میں ہاف مین سے کرتا ہے تو وہ برملا جواب دیتا ہے کوئی بھی غیر ملکی کسی معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور اقدار یا پھر وہاں پر بسنے والوں کی سوچ سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن

عطائی کے ڈرائینگ روم کی حالت اور بالخصوص امبر جان کی حالت دیکھ کر ہاف مین طنزیہ مسکراتا ہے۔ کبیر اور ہاف مین کے درج ذیل مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی ممالک آج بھی ہمیں ہر اعتبار سے اپنے سے کمتر اور اپنا غلام سمجھتے ہیں۔

" تم ہمارے ملکی معاملات میں دخل مت دو تمہارا تعلق صرف ہمارے آثار قدیمہ سے ہونا چاہیے۔ میرے آثار قدیمہ میرے غلام باغ کے سابقہ مالک کے یہاں موجود ہیں اور اس حال میں ہوں تو میں لا تعلق کیسے رہ سکتا ہوں۔ ہاف مین ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ غلام باغ کے مالک صرف غلام ہو سکتے ہیں۔ خواجہ سرا نہیں۔۔۔۔۔ کبیر نے کہا۔ خواجہ سرا بھی تو غلام ہی ہوتے ہیں ہاف مین نے کہا"(۹)

مرزا اطہر بیگ نے اپنے ناول میں مغربی اقوام کے لیے گوری اقوام اور تہذیب یافتہ اقوام کی اصطلاحات طنزا استعمال کی ہے۔ اور اسی گوری اقوام کے خلاف جب کبیر کا مزاحمتی رویہ سامنے آتا ہے تو ہاف مین کبیر کے بارے میں کہتا ہے کہ " بے چارا کبیر اور نو سامراجیت "۔ دوسری طرف جب ناول نگار نے ناول میں مانگر جاتی قبیلے کی تاریخ اور ان کے خاندانی نظام کو تفصیل سے بیان کیا ہے وہاں کے ممتاز قبیلے پگل اوت کا چھر تھے۔ مانگر جاتیوں کی پگلوں اور کاچھروں کے ساتھ تعلقات بھی تفصیل کے ساتھ ناول میں بیان کیے گئے ہیں۔ مانگر عورتیں پگلوں اور کاچھروں کے گھروں ہیں ملازم ہوا کرتی تھیں جب کوئی مانگر معزز قبیلوں میں سے کسی کی برابری کی کوششکرتا یا انہیں نقل کرنے کی کوشش کرتا تو اسے دیوانہ قرار دیا جاتا تھا، اور اذیت دے کر مار دیا جاتا تھا کیونکہ "طاقت کی نعرے بازی ایک سامراجی ماحول میں استعمال کیے جانے پر بہت آسانی سے مہربانی کا ایک التباس پیدا کر دیتی ہے"(۱۰) مابعد نوآبادیاتی عہد میں اگر ہم ارزل نسلوں کی کہانی کو پرکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ارزل نسلیں ہم ہی ہیں جنہیں آج تک اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ وہ کاچھر یا پگل کا مقابلہ کر سکیں۔ یاور عطائی کا باپ خادم حسین کئی نسلوں کی بے توقیری کے بعد جب ڈاکیا بنتا ہے اور قصبے کے سردار اسے ارزل کاموں کے لیے موزوں سمجھتے ہیں تو باپ بیٹے کا مکالمہ تمام حقیقت کو واضح انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ "ہم پنچ نسل کے لوگ ہیں اباجی۔ مانگر جاتی وہ ارزل نسل ہے جو سوکڑ نہر کے کنارے تپڑیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتی ہے۔ بلکہ یہ بھی میں نے غلط کہا کوئی بھی کیڑا مکوڑا اپنی نسل کے رہن سہن سے نیچے نہیں رہتا، یہ انسانوں میں ہی ہے"(۱۱) اور پھر یہی خادم حسین کا بیٹا یاور حسین بعد میں یاور عطائی بنتا ہے۔ اور اس کے پاس باپ کی طرف سے دی گئی "گنجینہ نشاط" موجود ہے اور ناول میں اسی گنجینہ نشاط کی مدد سے ہی کاچھروں اور پگلوں کو اپنے قابو میں کیا ناول میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یاور عطائی نے پورے معاشرے کو اپنے قبضے میں

کیا ہوا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی صورت حال ایسی ہی نظر آتی ہے کہ اب گنجینہ نشاط مغربی اقوام کے پاس ہے اور وہ ہمیں غلام بنانے کا دوبارہ سے سوچ رہے ہیں۔ کبیر، ڈاکٹر ناصر، فریڈرک ہاف مین یاور عطائی اور گرٹریوڈ کے علاوہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ، رنگو بھائی اور زہرہ کا کردار بھی ہمیں مابعد نو آبادیاتی عہد میں صورت حال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ناول نگار نے زہرہ کے کردار کو ناول کی روایتی ہیر وئینوں سے مختلف پیش کیا ہے وہ حال سے زیادہ اپنے ماضی کو جاننے میں سر گرداں ہے اور اپنی شناخت کی تلاش میں مضطرب نظر آتی ہے اسی کشمکش اور تلاش میں وہ جب مانگر جو جاتی ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ اسی کردار کی مدد سے ناول نگار نے تیسری دنیا کے ہر اس فرد کی نمائندگی کی ہے جو آج اکیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں بھی کئی سوالوں کے جواب کا متلاشی ہے۔ مثال کے طور پر وہ کون ہے؟ وہ کیا ہے؟ ان کی اصل پہچان کیا ہے؟ کیا وہ واقعتاار زل نسلیں ہیں؟ کیا یہی ان کی شناخت کا اہم حوالہ ہے؟ وہ ہی ارزل نسلیں کیوں ہیں؟ کیا ان کا شمار ہمیشہ اسی حوالے سے کیا جائے گا؟ ان تمام سوالات کا مطالعہ جب تاریخ کے تناظر میں کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار سے ناواقف لوگ ہیں، اپنی تہذیب و ثقافت کو مسخ ہوتا دیکھ رہے ہیں اور بالخصوص معاشرے کی اسٹوٹ پھوٹ انسان کی اپنی شناخت کہیں گم ہوتی جارہی ہے جس وجہ سے وہ مضطرب اور پریشان نظر آتا ہے۔ ماضی کے دھندلکوں میں اسے اپنا حال نظر نہیں آتا بلکہ مستقبل ایک خوف کی صورت میں منڈلاتا رہتا ہے۔ اس بات کی وضاحت فرانز فینن ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ” آپ اسے قومی آزادی پکاریں، قومی نشاۃ ثانیہ کا نام دیں، عوام الناس کو ایک قومیت کے سانچے میں ڈھالنا کہیں، دولت مشترکہ کے نام سے منسوب کریں، خواہ کوئی عنوان دیں اور کسی کلیہ کو کام میں لائیں، استعمار کی شکست ہمیشہ ایک متشددانہ عمل ہوتا ہے۔ ہم خواہ کسی سطح پر بھی اس کا مطالعہ کریں“(۱۲)

ہم نے اس شکست کے بعد آزادی تو حاصل کر لی لیکن ہم خوف کی دنیا سے آزادی نہیں حاصل کر سکے۔ اس بحث کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول "غلام باغ" کی کہانی اور کردار مابعد نو آبادیاتی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ قدیم رکھ رکھاو اور روایتی وضع داری کا نمائندہ کردار ہے۔ اس کردار کی مدد سے نو آبادیاتی دور کی تمام قباحتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے دراصل اس کردار میں ہمیں مغرب پرستی نظر اتی ہے جبکہ رنگو بھائی ایک ایسے کردار کے طور پر ہمارے سامنے اتا ہے جو انگریزوں سے خاصا مرعوب ہے اور دنیا کا ارزل ترین کام بھی وہ خلوص نیت اور افضل ترین سمجھ کر کرتا ہے۔ یاور عطائی کے ڈرائنگ روم میں جب

کلب کے تمام راکین جمع ہوتے ہیں زیادہ شراب پی لینے کی وجہ سے وہاں پر بیٹھے کسی انگریز کوا گرتے اجاتی تو رنگو بھائی اسے یوں بھاگ کر صاف کرتا کہ ایک منٹ کو گمان ہوتا کہ رنگو کے لاشعور میں غلامی کا دورا بھی تک زندہ ہے، وہ اج بھی ان اقوام کو مہذب، تعلیم یافتہ اور باشعور سمجھتا ہے۔اس نے انگریزوں کے کنگ جارج کلب میں اس وقت ملازمت شروع کی تھی جب وہ صرف سولہ سال کا تھااور بڑھاپے میں بھی وہ وہیں کام کر رہا تھا۔ اس کلب میں جب بوڑھے ملازم کو کبیر نے غلاظت اٹھاتے دیکھا تو اس نے یاور عطائی سے کہا"میرے اوپر یہ انکشاف ہوا ہے عطائی صاحب کہ دنیا کا گھٹیا ترین اور ذلیل ترین، مکروہ کام بھی انتہائی اعلیٰ درجے کی فنکارانہ مہارت سے سرانجام دیا جاسکتا ہے"(۱۳) رنگو کا کردار تیسری دنیا کی ان ارزل نسلوں کا نمائندہ کردار ہے جو ہمیشہ سے ذہنی غلامی کا شکار ہیں اور ارتقا کی کسی بھی صورت کو قبول کرنے اسے انکاری رہتے ہیں۔ کبیر کا درج بالا مکالمہ بہتسے سوالات کو جنم دیتا ہے کہ کیا اعلیٰ وارفع کام صرف مغربی اقوام ہی سرانجام دے سکتی ہیں؟ ہم غلامی کو کب تک فخر سے قبول کرتے رہیں گے؟ کیا تیسری دنیا کے لوگ ہمیشہ ہی ارزل نسل کہلائیں گے؟ دراصل یہ تمام سوال قاری کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی دور میں جب ہم اس ناول کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نہایت باریک بینی سے ہر اس کردار کو تاریخی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جو نوآبادیاتی دور کی دین ہیں۔اس امر کی وضاحت ڈاکٹر رخسانہ بلوچ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> " غلام باغ عام ڈگر سے ہٹا ہوا ناول ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ آثار قدیمہ سے متعلق مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے۔اس میں نوآبادیاتی معاشرے میں سرگرم عمل کرداروں میں سے کچھ کے اعصابی اختلال کا ذکر کرتے ہوئے اس پاگل پن کا سراغ لگایا گیا ہے جو کسی کو محکوم اور غلام اور کسی کو ازآد اور مقتدر بنانے میں معاونت کرتا ہے"(۱۴)

ان تصریحات کے بعد یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس ناول میں موجود تمام کردار ماضی کے نوآبادیاتی دریچوں میں جھانکتے ہیں، کبھی مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہیں اور کبھی غلامی کے خوف میں مبتلا ہیں یہ کشمکش اغاز سے اختتام تک جاری رہتی ہے۔ ناول کا موضوع امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی موجودہ نوآبادیاتی صورت حال اور یورپ کی سابقہ نوآبادیاتی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس ناول کا مرکزی کردار کبیر مہدی ایک ایسا مضطرب کردار ہے جو اپنی تہذیب وثقافت کی تلاش میں ہے جسے یورپی سامراج اور گوروں سے فکری اور ذہنی آزادی حاصل کرنی ہے اور وہ مکمل طور پر مغربی سامراجی آئیڈیالوجی کو رد کرتا ہے۔ وہ ناول میں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ہم کھوکھلی تہذیب کے پیچھے بھاگے چلے جارہے ہیں جبکہ کسی بھی قوم کی پہچان اس کی اپنی تہذیب وثقافت ہوا کرتی

ہے اس صورت ھال میں تو ہماری اپنی پہچان ہی ختم ہوتی جارہی ہے۔ ناول میں ہاف مین کا کردار کی مرکزی اہمیت کا حامل ہے جو کہ اپنے خیالات سے، مغربی اقوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ بظاہر تو وہ غلام باغ میں تحقیق کی غرض سے آیا ہے لیکن اصل میں وہ اس خزانے کی تلاش میں ہے جو اس کے مطابق قیمتی اشرفیوں کی صورت میں اس باغ میں موجود ہے۔ اس کے کردار اور ذہنیت کا اندازہ ہم کبیر سے کیے گئے مکالموں کی صورت میں لگا سکتے ہیں جب اسے کبیر کا معاشرہ ہی دقیانوس نظر آتا ہے دراصل وہ مغربی فکر کا نمائندہ کردار ہے، جب اس کی محبوبہ گرٹریوڈ کو مقامی لوگوں سے شدید نفرت محسوس ہوتی ہے اور وہہاف مین سے بار بار کہتی ہے کہ ان نیچ اور مقامی لوگوں سے دور رہو اسے انہیں مقامیلوگوں کی آنکھوں میں جنسی بھوک نظر آتی ہے، اس کے علاوہ وہ بار بار ہاف مین سے کہتی ہے کہ مقامی لوگوں سے دور رہو۔ ناول میں بارہا ایسے مکالمے قاری کے سامنے آتے ہیں جو نوآبادیاتی عہد اور مابعد نوآبادیاتی عہد کی صورت حال کی منظر کشی کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غلام باغ کا ہر کردار اپنی آئیڈیالوجی رکھتا ہے جو انسان کی انسان پر غلبہ پانے کی خواہش پر مبنی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سہیل احمد خان، غلام باغ،اطہر بیگ، مرزا،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)، ص: ۲

۲۔ رؤف نیازی، مابعد جدیدیت: تاریخ و تنقید، (کراچی: مطبوعات نیازیہ، سن ندارد) ، ص: ۱۰۱

۳۔ بیگم سفینہ، اردو ناول نظری و عملی تنقید، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۲۲ء)، ص: ۲۲۲

۴۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص: ۱۲

۵۔ ایضا، ص: ۱۸

۶۔ ایضا، ص: ۲۴

۷۔ ایضا، ص: ۳۲

۸۔ ایضا، ص: ۱۸۷

۹۔ ایضا، ص: ۲۹۳

۱۰۔ ایڈورڈ سعید (مترجم: یاسر جواد)، ثقافت اور سامراج، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء)، ص: ۷

۱۱۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص: ۷۱

۱۲۔ فرانز فینن (مترجم: محمد پرویز، سجاد/باقر رضوی) ، افتادگان خاک، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۲ء)، ص: ۲۷

۱۳۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص: ۲۷۶

۱۴۔ رخسانہ بلوچ، ڈاکٹر، اردو ناول: تجزیاتی مطالعہ، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۲۰)، ص: ۵۳